اوکسفرڈ

اُردو ورثہ

انتخابِ کلام
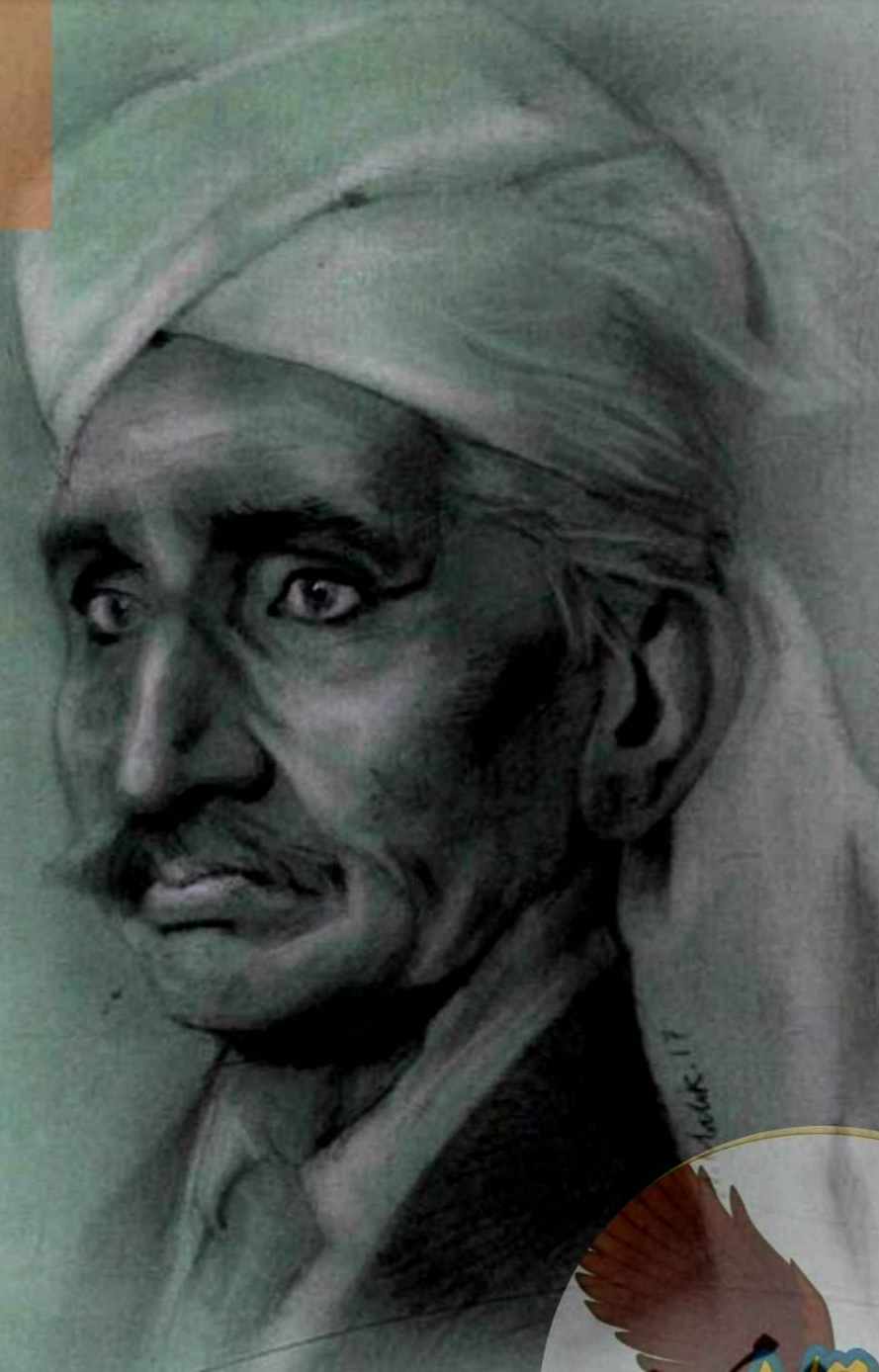
تلوک چند محروم

ترتیب و تعارف: معین الدین عقیل

اُردو ورثہ

انتخابِ کلام

تلوک چند محروم

ترتیب و تعارف: معین الدین عقیل
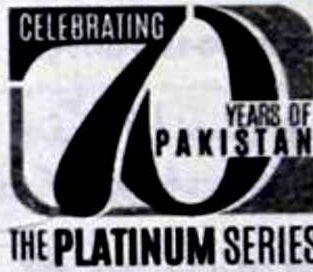
OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔
یہ دنیا بھر میں بذریعۂ اشاعت تحقیق، علم و فضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے مقاصد کے فروغ میں
یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے۔ Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں
اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے

پاکستان میں امینہ سیّد نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا،
پی۔او بکس ۸۲۱۴، کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان
سے شائع کی

پہلی اشاعت ۲۰۱۷ء

ISBN 978-0-19-940776-7

نوری نستعلیق فونٹ میں کمپوز ہوئی
۶۸ گرام لوکل اوفسیٹ کاغذ پر طبع ہوئی

چیلنجر پرنٹرز، کراچی میں طبع ہوئی

اظہارِ تشکر
سرورق کی مصوری: عبدالمالک چنّا

فہرست

بچوں کے لیے

تعارف

بیسویں صدی میں جن اردو شعرا نے اپنی شاعری اور خصوصاً نظم نگاری کے سبب مقام و امتیاز پایا ان میں تلوک چند محروم کا نام بھی شامل ہے۔ نام تلوک چند، تخلص محروم۔ یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو ایک چھوٹے سے گاؤں گاجراں والا، تحصیل عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں میٹرک کرنے کے بعد ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور کلور کوٹ میں بطور انگریزی استاد اور بعد ازاں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔ دورانِ ملازمت ہی نجی طور پر پنجاب یونیورسٹی سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات دے کر کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں گورڈن کالج، راولپنڈی میں اردو اور فارسی زبانوں کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت منتقل ہو گئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ پہلے روزنامہ تیج میں کام کیا اور پھر دہلی میں واقع پنجاب یونیورسٹی کے کیمپس میں اردو و فارسی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ ان کے ورثے میں ان کی اپنی متنوع تخلیقات کے علاوہ ایک فرزند جگن ناتھ آزاد بھی ہیں جو اپنے عہد کے ممتاز شاعر اور اقبالیات کے ماہر اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

محروم نے ایک غیر ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس ماحول میں محروم نے شاعری شروع کی۔ شاعری میں اگرچہ ان کی تخلیق کردہ غزلیں اور رباعیات بھی ایک امتیازی مزاج ولب و لہجے کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن نظم میں اخلاقی، سماجی اور فطری مضامین کی بہتات ہے اور ایسے موضوعات نظم کرنے میں محروم کو کمال حاصل تھا۔ زبان کی صحت و صفائی، سادگی اور طرزِ بیان میں ندرت و رعنائی اور موضوع کی مناسبت سے موزوں الفاظ اور مناسب بحروں کے انتخاب میں انھیں خاصا ملکہ حاصل تھا کہ ہر طرح کے موضوعات شاعری میں ڈھل کر ایک جاذبیت و کشش پیدا کر دیتے ہیں، چنانچہ

وہ اپنے اسلوب کے باعث اپنے معاصرین میں ایک مختلف و منفرد لب و لہجے کے شاعر قرار دیے گئے ہیں۔ اظہار میں سنجیدگی اور برجستگی اور روانی، یہ سب مل کر ان کے کلام کو پُرکشش بنانے کے ساتھ ساتھ خیال اور معنویت سے بھی مالامال کرتے ہیں۔ منظر نگاری میں تو ان کا قلم ایک مصور کے قلم سے کم نہ ہوتا تھا۔ سماجی و سیاسی اور قومی مسائل بھی ان کی نظموں کا موضوع بنتے رہے اور صلح کُل ان کا ایک بنیادی و مرکزی مطمحِ نظر رہا، جو ان کی نظموں کا ایک اہم مقصد و مدعا بھی نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک استاد تھے اور بچوں سے زندگی بھر ان کا تعلق رہا، اس لیے بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیاں اور خواہشات بھی ان کی نظموں کے موضوعات بنتے رہے۔

تاریخ بھی محروم کی شاعری کے موضوعات میں ایک حاوی موضوع رہا ہے۔ تاریخی شخصیات و کردار اور واقعات اور حوادث کو بھی انھوں نے اپنے نمایاں اور منفرد موضوعات کے طور پر اختیار کیا اور بعض نظمیں، جو انھوں نے مشاہیرِ قوم پر تخلیق کیں، وہ کئی اعتبار سے پُرکشش اور پُراثر ہیں۔ اسی طرح دریائے سندھ، جس کے کنارے کے ایک گاؤں میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس کو ۱۸۹۲ء میں سیلاب نے تباہ کردیا تو اس تباہی کا ان پر بڑا اثر ہوا اور انھوں نے متعدد نظموں میں دریا کو ایک اہم موضوع کے طور پر جگہ دی۔ ''کنارِ راوی'' بھی ان کی اسی نوعیت کی ایک پُراثر نظم ہے۔ اپنی ایسی خصوصیات اور امتیازاتِ شعری کے سبب وہ بیسویں صدی کے نمایاں اور ممتاز قومی و وطنی شاعر اور نظم نگار کی حیثیت سے تاریخ ادب کا حصہ رہیں گے۔

چونکہ محروم نے ایک مستقل مزاج شاعر کے طور پر تخلیقی زندگی گزاری ہے اس لیے ان کا تخلیق کردہ شعری سرمایہ کچھ کم نہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں کلام محروم (دو جلدیں)، گنج معانی، کاروانِ وطن، شعلہ نوا، تصویر معانی، دو آتشہ، رباعیاتِ محروم، نیرنگِ معانی، بہار طفلی، بچوں کی دنیا زیادہ معروف مجموعے ہیں۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

حمد

اے خالقِ دشت و جَبَل و قُلزم و صحرا　　اے مالکِ افلاک و مہ و مہر و ثُریّا
ہر نقش میں، اے نقش طرا زندۂ دنیا　　دیکھا ہے بہ حیرت تری قدرت کا تماشا
بے جاں تری مخلوق ہے یا صاحبِ جاں ہے
ہر نوع سے پیدا تری قدرت کا نشاں ہے

دریائے فراواں تری قدرت سے رواں ہے　　اِستادہ ترے حکم سے ہر کوہِ گراں ہے
اِیما سے ترے محوِ سفر بادِ وزاں ہے　　پتّھر میں شرارہ تری حکمت سے نہاں ہے
جامد ہے کوئی یا متحرک ہے کہ سیّال
پابند ترے حکم کی ہر شے ہے بہ ہر حال

سمٹے ہوئے ساحل میں ہیں ذخّار سمندر　　رَوکے جو نہ تو اُن کو تو چڑھ جائیں زمیں پر
تُو اس کو نہ دے زور تو اے خالقِ برتر　　اِک تنکا اُڑا سکنے میں معذور ہو صرصر
بے تاب رہے اَبر میں اور گرنے نہ پائے
بجلی کو اگر تیرا اشارہ نہ گرائے

تنویر تری پرتوِ خورشید و قمر میں　　توقیر تری سیم و زر و لعل و گہر میں
تاثیر تری نغمۂ مرغانِ سحر میں　　تصویر تری چشمِ جہاں بینِ بشر میں
اِترائے اگر اس پہ بشر، بھول ہے اس کی
یہ بات نہ معقول نہ مقبول ہے اس کی

شکرِ احساں

تیرے احسان و کرم حدِّ بیاں سے بڑھ گئے
ٹُوٹے پھُوٹے لفظ ہیں میری زباں پر شُکر کے
ہو زباں ہر مُوئے تن اور محوِ گنتی میں رہے
پھر بھی ناممکن ترے الطاف کوئی گِن سکے
شکرِ احساں کی مرے خالق مجھے توفیق دے!

میری مُشتِ خاک میں، تُو نے ہی اے پروردگار
بھر دیے ہیں روزِ اوّل سے محبت کے شرار
ہے رہینِ فضل و رحمت ہستیِ ناپائدار
تجھ سے ہے حمد و ثنا میں رُوح میری نغمہ بار
تُو نے خود بخشا ہے ذوقِ نغمہ پردازی اِسے

اِلتجا ہے تجھ سے اے خالق! بصد عجز و نیاز
تیری رحمت جس طرح پہلے رہی ہے کارساز
سایہ دامانِ رحمت اب بھی ہو مجھ پر دراز
میری نظروں میں حقیقت پر نہ ہو فائق مجاز
گو رہوں میں اس میں مگر مجھ میں نہ یہ دُنیا رہے!

مجھ کو دولت کی ہوس ہو اور نہ ہو شہرت کی چاہ
طے کروں مرضی سے تیری منزلِ اصلی کی راہ
سینہ ہو داغِ محبّت سے مرا مانندِ ماہ
جلوۂ مستور پر تیرے رہے دائم نگاہ
منزلِ اصلی رہے میری نظر کے سامنے!

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورِ جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہُوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا!
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا
یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے ہُو کا نظارا

آراستہ جن کے لیے گلزار و چمن تھے
جو نازکی میں داغ دہِ برگ و سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لیے روحِ رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخش جہاں تھے
تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

دریائے سندھ کی یاد

اے سندھ! تری یاد میں جمنا کے کنارے
آنکھوں سے اُبل آئے ہیں احساس کے دھارے
وابستہ طفلی و جوانی وہ نظارے
موجود تصور کی نگاہوں میں ہیں سارے
آزادیِ تخیل کا اعجاز عیاں ہے
پابندِ مکاں ہے نہ یہ محتاجِ زباں ہے

اِک گاؤں ترے ساحلِ خرّم پہ ہے آباد
ساحل وہ ترا جلوہ گہِ حسنِ خدا داد
یہ ساٹھ برس پہلے کی اے سندھ ہے روداد
اِس عالمِ پیری میں بھی آتے ہیں مجھے یاد
وہ کھیت وہ جنگل، وہ جزیرے وہ سفینے
وہ حسنِ دلآویز کے جاں بخش خزینے

میں وہ کہ لڑکپن سے جو تھا تیرا پجاری
ظاہر میں نہ تھا گو عملِ سجدہ گزاری
تھا میری نظر میں کرمِ خالقِ باری
وہ سیر کناروں کی، وہ موجوں کی سواری
چکّر ترے گرداب کے اب بھی ہیں نظر میں
دل میں وہی طوفان ہے، سودا وہی سر میں

ساون وہی، گھنگھور گھٹائیں بھی وہی ہیں
دکھّن کے سمندر کی ہوائیں بھی وہی ہیں
سبزے کے لہکنے کی ادائیں بھی وہی ہیں
رنگیں، شفق آلود فضائیں بھی وہی ہیں
ایسے میں ترا جوشِ طرب یاد جو آئے
دل پہلو میں کس طرح نہ طوفان اٹھائے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ
آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہِ حسنِ خداداد جو قریہ
ہر قیدِ تکلف سے تھا آزاد جو قریہ
بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون تو ہو گا وہی، ہو گرچہ زمیں اور

پنگھٹ اُسی صورت کے اُسی شان کے ہوں گے
ساماں دلِ شوریدہ کے سامان کے ہوں گے
انسان جو ہمدرد تھے، انسان کے ہوں گے
کچھ اُن میں ابھی تک مری پہچان کے ہوں گے
افسوس رسائی مری ہو گی نہ وہاں تک
اب روئیے ایامِ گزشتہ کو کہاں تک

کنارِ راوی

غم دل آفت سماوی ہے　　زندگی موت کے مساوی ہے
زخم پنہاں جگر پہ حاوی ہے　　اشک ریزی جگر تراوی ہے
ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں　　ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشن دہر میں فراغ کہاں　　چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں
اُڑ چلے طائر آشیانوں کو　　ملا آرام باغبانوں کو
نغمے یاد آئے نغمہ خوانوں کو　　کیا کروں سُن کے مَیں ترانوں کو
خواہ چرواہے، خواہ چوپائے　　شوق سے اپنے گھر کو پھر آئے
خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے　　کیا کرے ہائے! کوئی بتلائے
مہرِ تاباں تھا مائل آرام　　کوہِ مغرب میں جا کیا بسرام
آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے　　جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کیے ہزاروں نے　　آنکھ اُٹھائی نہ غم کے ماروں نے
بیقراری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟　　آہ وزاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟
دلفگاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟　　اشکباری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟
دل وحشی کا مدعا غم ہے　　ابتدا غم ہے انتہا غم ہے
یوں تو دل پر مرے سدا غم ہے　　غم مرگِ پدر نیا غم ہے
خوں فشاں کب سے چشم پُرنم ہے　　دشتِ غربت ہے شام ماتم ہے

شامِ غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

پروانہ

آفریں! ننھے سے کیڑے آفریں!
یہ ذرا سی جاں، یہ عشق آتشیں

بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں
تیرے مرنے کی ادا ہے دل نشیں

شکوۂ حسنِ تغافل کیش کیا
جز فنائے عشق بیش از بیش کیا

اُڑتے اُڑتے آن پہونچا شمع پر
وہ جھلس کر رہ گئے نازک سے پر

ہو گیا افسانۂ غم مختصر
جل بجھا بے شکوۂ سوزِ جگر

حسن کے شعلے سے لپٹا آن میں
جینے مرنے کو نہ لایا دھیان میں

اُف! یہ تیرا تھرتھرانا گرد شمع
اضطرابِ عاشقانہ گرد شمع

یہ تیرا چکر لگانا گرد شمع
ہے طواف مخلصانہ گرد شمع

شام کو چھپ چھپ کے یہ آنا ترا
چپکے چپکے ہائے! جل جانا ترا

عشق پروانے کا ہے باقی ہوس
جس کو جلنے میں نہیں کچھ پیش و پس

بوالہوس لاکھوں ہیں یاں مثلِ مگس
ہیں جو شہرِ عشق میں خاشاک و خس

ایسے عاشق ہر جگہ ہیں خیل خیل
عاشقی بدنام ہے جن کے طفیل

سیکھ پروانے سے آئینِ وفا
جسکا جل بجھنا ہے تلقینِ وفا

شمع خود ہے پیروِ دینِ وفا
قدر دان و منزلت بینِ وفا

ساتھ ڈھلتی رات کے ڈھلتی ہوئی
تا سحر روتی ہے یہ جلتی ہوئی!

دل میں پیدا ہمتِ پروانہ کر
ورنہ مرغِ شوق کا پَروا نہ کر

راز تنہائی کیسی پروا نہ کر
اپنی ہستی کی ذرا پَروا نہ کر

دل کو تو پہلے جلا پھر آپ جل
عشق کا دعویٰ ہے تو چپ چاپ جل

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ مجبوری و بے نوائی کی باتیں
نہ ناطاقتی، نارسائی کی باتیں
زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں
یہ ہیں سربسر جگ ہنسائی کی باتیں
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

پر و بال اپنے اسیرو، سنبھالو
اٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ، پھندے سے گردن نکالو
بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنا لو
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

اگر دانے دانے پہ لڑتے رہو گے
جو اک دوسرے سے بگڑتے رہو گے
قفس میں اگر تم اکڑتے رہو گے
پڑے قید میں یونہی سڑتے رہو گے
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

نہ سنگِ اسیری کو سینے پہ دھرنا
جو مرنا تو صحنِ گلستاں میں مرنا
اگر کچھ حمیّت ہے، یہ کام کرنا
پھڑکنا، تڑپنا، اُچھلنا، اُبھرنا
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ جھوٹے ہیں سب وعدہ ہائے رہائی
نہ ان پر رکھو اپنی بخت آزمائی
اُڑی ہے گلستاں میں کل یہ ہوائی
کہ صیّاد نے اور قینچی منگائی
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

قفس میں تمھیں مُدتیں کٹ چکی ہیں
بہاریں کئی قید میں ہو گئی ہیں
چمن میں نئی آہ! کلیاں کِھلی ہیں
اُٹھو پھر کہ ایامِ دلبستگی ہیں
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

مری بات سُن لو، اِدھر آؤ، دیکھو
نہ وعدوں پہ صیّاد کے جاؤ، دیکھو
نہ کچھ آؤ دیکھو، نہ کچھ تاؤ دیکھو
نکل جاؤ، جب راستہ پاؤ دیکھو
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

ملّتِ اسلامیہ کا ذوقِ سخن

اے ملّتِ اسلام، ترے ذوقِ سخن سے
فردوسِ نظر عالمِ معنی کا ہے گلزار
ہر سرو یہاں مصرعِ برجستہ ہے گویا
اشجار پہ طاری ہے ترے عالمِ اشعار
مستانہ کسی کنج میں عاشق ہیں نوا سنج
عارف ہیں کہیں نغمہ سرا بادلِ ہُشیار
ہیں فلسفی اِک سمت خراماں رَوِشوں پر
دامانِ ترنّم میں لیے گوہرِ افکار
جھلکی نظر آتی ہے یہاں حسنِ ازل کی
کتنا متجلی ہوا آئینۂ گفتار
اعجاز سے کچھ کم نہیں یہ نطق کا جادو
بے پردہ ہوئے جاتے ہیں سب روح کے اسرار
تبریزی و رومی کی نواؤں سے ہے پیہم
وہ حسن کی بارش کہ ہے جاں مطلعِ انوار
ہے روحِ بشر اس کے تجسس میں ازل سے
جس حسن کے ہیں پردہ کشا جامی و عطّار
نغموں سے ہے لبریز ہوا تیرے چمن کی
کتنی ہے دلآویز فضا تیرے چمن کی

بیٹے کے نام

یہ دُعا ہے راحتِ جانِ حزیں تیرے لیے
دورِ عالم ہو مسرّت آفریں تیرے لیے
باطنِ مہر و مہ و انجم پہ ہو تیری نظر
جابجا ہو جلوۂ نورِ یقیں تیرے لیے
آسمانوں سے ہو تجھ پر بارشِ الطافِ حق
باغ گلہائے وفا کا ہو زمیں تیرے لیے
زیست کی تلخی جو ہو تیرے مقدر میں کہیں
وہ دُعاؤں سے مری ہو انگبیں تیرے لیے
اِن دعاؤں کے سوا، اِن آرزوؤں کے بغیر
پاس میرے سیم و زر کوئی نہیں تیرے لیے
عزم و استقلال و تسکیں ہوں سدا ہم دم ترے
راستی، صدق و صفا ہوں مونسِ پیہم ترے
شکرِ ایزد! دل ترا ہُشیار ہے فرزانہ ہے
ہر روش میں رسم و راہِ عام سے بیگانہ ہے
خوب شے ہے رسم و راہِ عام سے بیگانگی
میری نظروں میں اسی کا نام ہے فرزانگی
حق تجھے مائل بہ تقلید حق اندیشاں کرے
رہروِ سر منزلِ راہ صفا کیشاں کرے

کوہِ مَری

شاہکارِ دستِ قُدرت تھی یہ تعمیرِ حسیں
اِس میں پھر شامل ہوئی انساں کی تدبیرِ حسیں
حُسنِ فطرت کی حیات افروز تصویرِ حسیں
نوجواں شاعر کے خوابوں کی ہے تعبیرِ حسیں
عالمِ اجسام کی توقیر ہے کوہِ مری
چیل کا ہر نخلِ رعنا ہے لَوائے برتری
یہ درختوں سے لدے پہلو بہ پہلو کوہسار
پہلوئے کہسار دامن بستۂ ابرِ بہار
درمیانی وادیوں میں چھوٹے چھوٹے کِشت زار
کچھ ہیں سرتا پا زمرد اور کچھ ہیں زرنگار
جنّتِ نظارہ ہے ہر منظرِ کوہِ مری
وادی و کوہ و کمر میں ہے فسونِ دلبری
یہ فضائے رُوح پرور، یہ ہوائے جاں فزا
چار جانب جلوۂ نیرنگیِ صُبح و مسا
یہ نئی دُنیا نئے منظر نئے ارض و سما
ذرّے ذرّے میں تماشا قدرتِ اللہ کا
اس مقامِ زندگی پرَوَر کو کہتے ہیں مری
اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی زباں کی ابتری

دو منظر

۱

بارش سے پہلے

اس شعلہ زا سموم سے اللہ کی پناہ جس میں تپش ہے بھاڑ کی حِدّت تنور کی
جَل بھُن کے آج میں نے یہ محروم سے کہا پنڈی[۱] میں ساتھ لائے ہو گرمی کلور[۲] کی
بولا وہ یوں کہ صبر کرو اور دیکھ لو
رحمت نہیں ہے دُور خدائے غفور کی

۲

بارش کے بعد

یہ جاں فزا ہوائے طربناک واہ وا جس میں مہک ملی ہوئی گیسوئے حُور کی
اشجار جھومتے نظر آتے ہیں ہر طرف لہرا رہی ہے موج فضا میں سُرور کی
صحرا و کوہ و دشت و چمن تازہ ہو گئے
رحمت برس رہی ہے خدائے غفور کی

۱۔ راولپنڈی۔
۲۔ کلورکوٹ، ضلع میانوالی۔

نقشِ عبرت

(راولپنڈی میں ملکہ وکٹوریہ کے مجسّمے کو دیکھ کر)

وکٹوریہ کا بُت ہے اِک بے مثال پیکر پتّھر سے ہیں نمایاں آثارِ زندگانی
اِس شاہکارِ فن سے یکسر ہیں آشکارا پاکیزگی، شرافت، شاہنشہی، جوانی
سر پر ہے تاجِ زیبا، اُس تاج کا نمونہ مانندِ مہر تاباں تھی جس کی ضوفشانی
اک ہاتھ میں گُرہ ہے، اک میں عصائے شاہی یعنی ملی ہے اس کو دنیا کی حکمرانی

عبرت کی آنکھ لیکن کچھ اور دیکھتی ہے نیرنگِ دہر فانی، دنیا کی مہربانی
سردی ہو خواہ گرمی، بارش ہو خواہ آندھی بجلی گرائے بادل، برسائے خواہ پانی
رانی جہاں کھڑی ہے، ساکت وہیں کھڑی ہے بے شکوہ و شکایت، باصبرِ جاودانی
ہر ابتری میں گویا اِس پیکرِ حسیں کو قسمت نے سونپ دی ہے سڑکوں کی پاسبانی

سڑکوں کی پاسبانی سونپی گئی ہے اِس کو
توقیرِ ہفت کشور تھی جس کی راجدھانی

اِرشادِ حضرت علیؓ دربارۂ عقل

عقل سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں
عقل ہے انساں کا وصفِ برتریں

عقلِ کامل جس کو دیتا ہے خدا
اُس کے اخلاق و مقاصد، واہ وا

زینتِ انساں ہے صحت عقل کی
شکل پاتی ہے وہی اعمال کی

رہتے ہیں انسان مل کر عقل سے
عقل سے ہیں علم اور سب تجربے

عیب کا مصدر ہے قلّت عقل کی
گو مدارج میں ہو کتنی برتری!

کشمیر سے خطاب

صورتگرِ ازل نے صبحِ اَزَل دکھایا اپنا کمالِ صنعت، کر کے تجھے نمایاں
تجھ سا نظر نہ آیا دنیا میں اور کوئی گل پوش، گل بداماں، سرتا قدم گلستاں
اے انتخابِ عالم، اے افتخارِ دوراں
اے وادیِ گُل افشاں!

وہ نقشِ نازتُو ہے دنیائے رنگ و بُو میں بے رنگ جس سے رونق حسنِ فرنگ کی ہے
دنیا کے اہلِ ایماں کہتے ہیں جس کو جنّت شرمندہ ہو کے تجھ سے روپوش ہوگئی ہے
ورنہ کہیں تو ہوتے آثارِ باغِ رضواں
اے وادی گُل افشاں!

شاہوں کے قصر وایواں اس کوترس رہے ہیں جو فیضِ حُسن فطرت ہے تیرے جھونپڑوں میں
تُو ریشمی دوشالے دنیا کو دے رہا ہے تیرا جمالِ رنگیں رخشاں ہے چیتھڑوں میں
دورِ خزاں بھی تیرا ہے رشکِ صد بہاراں
اے وادیِ گُل افشاں!

دریا دلی سے اپنی قدرت نے تجھکو بخشے یہ چشمہ ہائے سیمیں، یہ آبشار تیرے
جانِ بہار تیرے باغات اور جنگل بھرپور سیم و زر سے یہ کوہسار تیرے
کیا تجھ کو احتیاجِ ظلِ ہوس پناہاں!
اے وادیِ گل افشاں!

گُزری مصیبتوں پر یہ کہہ کے مطمئن ہو سرمایۂ سعادت ہے درد مند ہونا
آئے ہیں خاتمے پر ایامِ نامساعد تقدیر میں تری ہے اب سر بلند ہونا
دھو ڈال اپنے دل سے داغِ ملالِ حرماں
اے وادیِ گُل افشاں!

صبر ہمارا جیت گیا

اُس وقت کو یاد نہ کر ہمدم جب دُور ہماری منزل تھی
تاریک تھیں جب راہیں ساری، بے نُور ہماری منزل تھی

جب قافلۂ ابنائے وطن سو بار گھرا طوفانوں میں
پر عزمِ صمیم سے اپنے وہ ہرگز نہ پھرا طوفانوں میں

دامانِ اَبد سے وابستہ پُر پیچ غلامی کی وادی
تھے دُور تصوّر کی حد سے انوارِ فضائے آزادی

سالار ہوئے قرباں کتنے اس محکومی کی گھاٹی میں
کتنے ہی لعل ملے اپنے مظلومی کی ماٹی میں

گزرے ہر اوگھٹ گھاٹی سے ہر سنگِ گراں کو چُور کیا
جب راہ میں خون کے دریا بھی آئے تو اُن کو عبور کیا

گو دار و رسن کے ہنگاموں کا گرم بہت بازار رہا
اور آقائی کے زور میں آقا مائلِ صد آزار رہا

پَر ذوق سِتم نے اس کے آخر خود اُس کو بدنام کیا
بے کار گئی تدبیر اس کی تقدیر نے اپنا کام کیا

اس وقت کو ہمدم یاد نہ کر، وہ دورِ غلامی بیت گیا
جب جور و ستم سب ہار گئے اور صبر ہمارا جیت گیا

لیکن اِس بات کو بھول نہ جا اے ساکنِ منزلِ آزادی
غفلت سے تری نذرِ طوفاں ہو جائے نہ ساحلِ آزادی

پھُول برساؤ

جن سرافرازوں کی رُوحیں آج ہیں افلاک پر
موت خود حیراں تھی جن کی جرأتِ بے باک پر
نقش جن کے نام ہیں اب تک دلِ غمناک پر
رحمتِ ایزد ہو دائم اُن کی جانِ پاک پر
پھُول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھُول برساؤ کہ پھولوں میں ہے خوشبوئے وفا
تھی سرشتِ پاک اُن کی عاشقِ خُوئے وفا
موت پر اُن کی، گئے جو روئے در روئے وفا
کیوں نہ ہوں اہلِ وطن کے اشکِ خوں جُوئے وفا
پھُول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھُول برساؤ کہ تھے اُن میں کئی ایسے جواں
نوجوانی جن کی تھی رشکِ بہارِ بوستاں
ہو گیا گلزارِ ہستی جن کا پامالِ خزاں
دے گئے لیکن وطن کو وہ بہارِ جاوداں
پھُول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

تھے وہ فخرِ آدمیّت، افتخارِ زندگی
تھے وہ انساں طرّۂ تاجِ وقارِ زندگی

اُن کے دم سے تھا چمن یہ خار زار زندگی
تھا نَفَس اُن کا نسیمِ نوبہارِ زندگی
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

چشمِ ظاہر بیں سمجھتی ہے کہ بس وہ مر گئے
درحقیقت موت کو فانی وہ ثابت کر گئے
جو وطن کے واسطے کٹوا کے اپنا سر گئے
خوں سے اپنے رنگ تصویرِ بقا میں بھر گئے
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

دیکھ لینا، خونِ ناحق رنگ اک دن لائے گا
خودغرض ظالم کیے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دورِ زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

جن کی قید و بند نے دلوائی آزادی ہمیں!
جن کی بربادی سے ہاتھ آئی ہے آبادی ہمیں
جن کے ماتم نے دیا ہے نغمۂ شادی ہمیں!
دے کے اپنی جاں، جینے کی تمنّا دی ہمیں
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

بزرگانِ سلف اور ہم

بے جا ہے ناز عظمتِ دیرینہ پر ہمیں نخلِ کہن سے خاک ملے گا ثمر ہمیں
غافل وہ ہیں کہ اتنی نہیں ہے خبر ہمیں اب کھینچ لے چلا ہے زمانہ کدھر ہمیں
قعرِ زمیں میں ہم ہیں، نظر آسماں پہ ہے اور رفعتِ سلف کا فسانہ زباں پہ ہے
اب تک طلسمِ خوابِ شبینہ نظر میں ہے اب تک گرانیِ مئے اسلاف سر میں ہے
خلقت تمام جاگ اُٹھی دورِ سحر میں ہے غافل پڑے ہیں ہم، شبِ تاریک گھر میں ہے
ہر چند اب نہ مے ہے نہ ساقی نہ جام ہے سر میں بھرا مگر وہی سودائے خام ہے
آقا ہوئے بزرگ ہمارے، غلام ہم وہ چشمۂ فیوض تھے اور تشنہ کام ہم
ممتاز وہ عمل سے تھے، حُسنِ صفات سے آلودہ ذات پات سے ہم، چھوت چھات سے
مانا کہ اُن میں تاجور و تاجدار تھے لشکر کش و غنیم کُش و کامگار تھے
فخرِ زمانہ، نازشِ ملک و دیار تھے دانائے رازِ گردشِ لیل و نہار تھے
اوصاف اُن کے آہ! تلف کر چکے ہیں ہم تذلیلِ رفتگانِ سلف کر چکے ہیں ہم
اخلاق اُن کا اور نہ ایثار ہم میں ہے باقی نہ اُن کی جرأتِ کردار ہم میں ہے
حق سے رہا جو اُن کو نہ وہ پیار ہم میں ہے ذوقِ حیات سے جو ہے بیزار ہم میں ہے

ممکن ہے اُن کے نقشِ قدم پر اگر چلیں
گزرے گئے زمانہ میں کچھ کام کر چلیں

ہماری حالت

بہے جاتے ہیں یارانِ وطن سیلابِ مغرب میں
کہ سُوجھی ہے نجات اپنی اُنھیں آدابِ مغرب میں
نہ تھی گویا کوئی تہذیب اپنی روئے عالم پر
کرم اپنا کیا ہے اہلِ مغرب نے بڑا ہم پر
سکھایا ہے ہمیں دنیا میں انساں کی طرح رہنا
مہذب بن کے رہنا اور بہت اچھی طرح رہنا
نظر ظاہر پہ رکھنا بھول جانا اپنے باطن کو
چلانا شب کو گھر میں دَور، دفتر میں قلم دن کو
تماشا گاہ میں بیوی کو اور بچّوں کو لے جانا
جو گانا سُن کے آئیں، اُن سے سننا اور خود گانا
سُرور آنکھوں میں آئے، لڑکیاں ناچیں جو مجلس میں
ترقی آرٹ کی ہے، کیا بُرائی ہے بھلا اس میں
سرود و رقص سے ہوتی ہے حاصل دل کو فرحت بھی
اُنھی اشغال سے قائم رہا کرتی ہے صحت بھی
تڑپ کر بھوک سے ہمسایہ مرتا ہے تو مرنے دو
کلب کو جاؤ تم، نیچر کو اپنا کام کرنے دو
غرض ہے عشرتِ امروز سے خوش ہیں اسے پاکر
نہیں پروا، وہ عزّت سے ملے یا گالیاں کھاکر
حمیّت مر چکی، لیکن کہیں ماتم نہیں اس کا
جنازہ اُٹھ گیا غیرت کا، لیکن غم نہیں اس کا

اِنقلابِ آسماں

دیکھ اے دل! انقلابِ آسمانِ فتنہ گر!
شامِ غم سے ہے مبدّل صبحِ خندانِ وطن
منظرِ صبح وطن ہے، شاہدِ چاکِ جگر!
مظہرِ رنگِ مقدّر شامِ حرمانِ وطن
جس طرح ماتم کناں کوئی ہو زُلفیں کھول کر
موبمو ہے اس طرح حالِ پریشانِ وطن
پتّا پتّا ہو گیا اِس باغ کا وقفِ خزاں
ہو گئی آخر بہارِ سرو ریحانِ وطن
داغ اب جتنے دلِ اہلِ وطن میں ہیں، کبھی
پھول تھے اُتنے ہی تجھ میں اے گلستانِ وطن
زخم اک بھرنے نہیں پاتا کہ لگ جاتا ہے اور
وقفِ صد بیچارگی ہیں چارہ کارانِ وطن
داغ ہر اک دل میں ہے اس حسرتِ دیرینہ کا
پھر ہو روشن اے خدا! شمع شبستانِ وطن

قافلے یوں بھی تلف ہوتے ہیں

قید سے ہوں گے رہا جب سرفروشانِ وطن
یوں کہیں گے دیکھ کر حالِ پریشانِ وطن
حیف ہم جن کے لیے محرومِ آزادی ہوئے
اپنے ہاتھوں سے وہ جاہل وقفِ بربادی ہوئے
جن کو چھوڑا ہم نے راہِ منزلِ مقصود پر
ہو گئے افسوس وہ دشتِ بلا میں منتشر
جن کی آزادی کی خاطر ہم ہوئے وقفِ بلا
مانگتے ہیں آج وہ اپنی غلامی کی دُعا
ہم گئے جن کو ہوا خواہِ اخوت چھوڑ کر
آج وہ بیٹھے ہیں سب ملّت کے رشتے توڑ کر
محفلِ حُبِ وطن میں کل جو تھے شیر و شکر!
آج ہیں اک دوسرے کے تشنۂ خوں سر بہ سر
وقت ہے اپنے کیے پر اب بھی پچھتائیں اگر
پھر سنبھل سکتے ہیں، دل میں کچھ بھی شرمائیں اگر

زِندانیوں کی عید

(تحریکِ خلافت کے دوران میں کہی گئی)

دیکھ کر تجھ کو اے ہلالِ عید
عید زِندانیوں کی یاد آئی

عید کیوں کر منائیں گے آخر
وہ اسیرانِ کنجِ تنہائی

اشکِ خونیں میں جلوہ گر ہو گا
رنگِ اظہار ناشکیبائی

یا کریں گے بسانِ مرغِ اسیر
درِ زنداں سے نالہ آرائی

یا پکاریں گے جوشِ وحشت میں
اے صبا، گھر سے کیا خبر لائی

یا گزاریں گے سینہ کوبی میں
ساعتِ صبحِ عیدِ تنہائی

ہوں گے یا عالمِ تصوّر میں
سحرِ عید کے تماشائی

تال پر بیڑیوں کی ناچیں گے
کھو کے ہوش اور بن کے سودائی

ہے یہ الزام ان دلیروں پر
جن کے تیور سے موت شرمائی

رہروانِ رہِ رضا ہیں وہ
خُوئے تسلیم کے ہیں شیدائی

سحر و شام اُن کا شیوہ ہے
شُکرِ خالق میں ناصیہ سائی

سرفروشانِ ملک وملّت سے
نہ رکھ اُمیدِ ناشکیبائی

غم زدوں کی عید

عید کے دن قیدی بیٹے کی ماں کے جذبات
(تحریکِ خلافت کے دوران)

اے نورِ چشم! حافظ و ناصر خدا ترا
ہم منتظر رہے، تجھے زنداں میں آئی عید

تیرے لیے دعائیں تھیں اور ذکر تھا ترا
سامانِ اشک و آہ سے ہم نے منائی عید

آ آ کے در سے تیرے احبّا پلٹ گئے
اِس غمکدے میں جب نظر اُن کو نہ آئی عید

رہ رہ کے تھی سکوت شکن بس یہی صدا
کیسی یہ تو نے اب کے مقدّر! دکھائی عید

افسردہ و ملول تھی وہ پیکرِ وفا
جس کے سہاگ میں تھی یہی ابتدائی عید

غمدیدگانِ ہجر کو تڑپا گئی ہے اَور
اندوہ و رنج وحسرت و افسوس لائی عید

بیتاب کر رہا ہے مرے دل کو یہ خیال
زندانیوں نے قید میں کیونکر منائی عید

احکامِ قید و بند بہت سخت ہیں وہاں
تیری ہوئی نہ ہوگی وہاں تک رسائی، عید

ہاں جادۂ رضا سے نہ اے دل ہو منحرف
غافل ہے صبر و شکر تری انتہائی عید!

بنامِ حسرت

اے عاشقِ آزادی، اے حسرتِ موہانی
اے پیکرِ بربادی، ناکامِ تن آسانی
جاں بازِ وطن تجھ سا پیدا نہ ہوا ہو گا
جرأت پہ تری قرباں خود جذبۂ قربانی
یہ لعل، یہ رنگینی اور اُس پہ یہ سنگینی
دل توڑ دیا تو نے اے ذوقِ ستم رانی
تاثیر دکھائے گی، بے سُود نہ جائے گی
یہ تیری دل افگاری، یہ تیری تن افشانی
جو بزم کی زینت تھے، جو رَزم کی شوکت تھے
بہتر تو نہ تھے اُن سے جو آج ہیں زندانی
اے اہلِ وطن سننا دل اور جگر تھامے
اُٹھتا ہے وہ زنداں سے پھر شورِ غزلخوانی

نوجوانانِ وطن سے گزارش

قوم کے اے نونہالو! اے جوانانِ وطن
تم سے وابستہ ہے اُمیدِ گلستانِ وطن
کیا تعجب؟ اس میں آ جائے نئے سر سے بہار
تم اگر ہو جاؤ رونق بخشِ بستانِ وطن
کام ہوتا ہے نہ بوڑھوں سے نہ بچّوں سے کوئی
کیا کریں خدمت وطن کی ناتوانانِ وطن
ہیں تمھارے دست و پا مضبوط، تازہ ہیں دماغ
تک رہی ہے آج تم کو چشمِ حیرانِ وطن
جاگزیں دل میں رہے ہر دم سُدیشی کا خیال
ہے یہی نسخہ مجرّب بہر درمانِ وطن
ہو وطن میں یا وطن سے دُور تم غربت میں ہو
حُبِ قومی جاں میں ہو اور دل میں ارمانِ وطن

قومی پستی کے آثار

جس قوم کے بچّے بے ادب ہوں
ماں باپ کے موردِ غضب ہوں
جس قوم کی عورتیں ہوں جاہل
اور سوئے فضولیات مائل
جس قوم کے نوجواں ہوں مغرور
رسم و رہِ انکسار سے دُور
جس قوم کے پیر بدزباں ہوں
اور غصّہ و غم سے نیم جاں ہوں
وہ قوم رہے گی پست دائم
ہو گی اُس کو شکست دائم

ایک نوجوان کی دُعا

دولت سے پیار دے، نہ غریبی سے عار دے
وہ چیز دے جو رُوح کو میری سنوار دے
تُو غیب سے مجھے دِل خدمت گزار دے
وہ دل جو حوصلہ نہ مصیبت میں ہار دے
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

بخشے اگر سعادتِ صدق و صفا مجھے
تب شُکر سے کہوں کہ جو چاہا، ملا مجھے
اپنے کرم سے کر وہ جوانی عطا مجھے
حاصل ہو جس سے خستہ دلوں کی دعا مجھے
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

علم و عمل کی طلعتِ جاں بخش پاؤں میں
ہر کم نصیب ذرّے کو تارا بناؤں میں
دے مجھ کو وہ اُمنگ کہ کچھ کر دکھاؤں میں
درپیش بیکسی ہو تو گھبرا نہ جاؤں میں
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

سینے میں ہو مرے دِل بے کینہ، اے خدا
ہر گرد سے ہو پاک یہ آئینہ، اے خدا
خالی ہو ہر غرض سے مرا سینہ، اے خدا
دردِ وطن کا اس میں ہو گنجینہ، اے خدا
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

ایک تصویر

سامنے ہے محوِ حیرت پیکرِ رنگینِ حُسن!
یہ ادائے خامشی ہے زیورِ تمکینِ حُسن
واہ وا! کیا حُسن کیا معصومیت کی شان ہے
اس کی آرائش میں بھی تقدیس کا سامان ہے
آفریں کہتا ہے دل اس حُسنِ زیبا کے لیے
احترام آموز ہے جو چشمِ بینا کے لیے
کس تصوّر میں ہے کیوں حیراں ہے یہ تصویرِ حُسن
کاوشِ پنہاں بھی ہے کیا شاملِ تقدیرِ حُسن
نقشہ ہے ماں باپ کے گھر کا نظر کے سامنے
صاف ہے وہ منظرِ زیبا نظر کے سامنے
جن کو اس سے پیار تھا، وہ جن پہ تھی جاں سے فدا
پھرتی ہیں وہ صورتیں اس گھر میں اب بھی جا بجا
کھیلتے پھرتے نظر آتے ہیں بھائی اور بہن
اُس بہن کا نام لیتے ہیں جو اب ہے بے وطن
گھر کے کاروبار میں مصروف ہیں گو ماں کے ہاتھ
یاد پردیسن کی ہے لپٹی ہوئی پر جان کے ساتھ
باپ کا چہرہ نظر آتا ہے کچھ مغموم سا
عمر ابھی اتنی نہیں لیکن بڑھاپا آ گیا

صحن میں گھر کے شجر ہے اور جُھولا بھی وہی
جُھولتا اس میں نظر لیکن نہیں آتا کوئی
ساتھ کی کھیلی ہوئی دو چار آئیں اور گئیں
جُھولنا اَب اُن کو پہلے کی طرح بھاتا نہیں
پُھول یہ جس کا ہے نظروں میں گلستاں ہے وہی
صبر کا دامن ہو جس سے چاک، ساماں ہے وہی
اب تخیّل کی فضا اس پر گراں ہونے لگی
اور اُداسی اِس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی

وادیِ غم

خامشی چھائی ہوئی ہے دامنِ کہسار میں
دم بخود بیٹھی ہے حیرت سایۂ اشجار میں
سرنگوں کوہ و شجر کی سرفرازی ہے یہاں
شام کے سایوں میں گیسو کی درازی ہے یہاں
طائروں کو اس جگہ گانے کی عادت ہی نہیں
ندیوں کو شور کرنے کی اجازت ہی نہیں

پَرتوِ خورشید کے مُنھ پر نقابِ سایہ ہے
صبح کا ملبوس ہے جو شام کا پیرایہ ہے
سبزہ و گُل پر یہاں ہر چند آتی ہے بہار
ہر برس آتی ہے یوں گویا کہ جاتی ہے بہار
پھر نہیں سکتی یہاں آوارہ راہوں میں نسیم
رہتی ہے گُم گشتہ اپنے دل کی آہوں میں نسیم

رنگ و بُو سے گُل میں اصلا شوخی و تیزی نہیں
فصلِ گُل میں دل کشی ہے، پر جنوں خیزی نہیں
چاندنی راتوں میں میلی ہے ردائے ماہتاب
چپکے چپکے جا رہا ہے سر جھکائے ماہتاب

بسکہ رقّت آفریں ہے رات کا منظر یہاں
چشمِ پُرنم کا گماں ہوتا ہے تاروں پر یہاں

اک سکُوتِ دائمی ہر شے پہ ہے چھایا ہوا
وقتِ پیدائش سے ہے ہر پھُول مُرجھایا ہوا

سبزۂ دامن کشاں چاروں طرف خوابیدہ سا
ہر شجر حیرت زدہ، دل گیر سا، غمدیدہ سا

سیر اِس وادی کی اکثر آ کے کر جاتا ہوں میں
میری نظروں میں یہ رہتی ہے جدھر جاتا ہوں میں

اُترا ہوا دریا

کس قدر اُترے ہوئے دریا کا ساحل ہے اُداس
دیکھ کر یہ منظرِ عبرت فزا دل ہے اُداس
اب نہ وہ جوشِ تلاطم ہے نہ موجوں کا خروش
صورتِ شہرِ خموشاں ہے فضا ساری خموش
خامشی پرُور سماں ساحل سے تا ساحلِ ہوا
فتنۂ محشر خرامی کا اثر زائل ہوا
راہ میں جس کی گرے نخلِ تناور سر کے بَل
اب اُسی کی سرزمیں پر ہے نیستاں کا عمل
جوشِ وحشت ہو چکا، تُندی گئی، تیزی گئی
ساغرِ صہبائے بدمستی کی لبریزی گئی
سرکشی موجوں کی باقی ہے نہ وہ آوارگی
ہر طرف چھائی ہے اک افسردگی، بیچارگی
یادگارِ ورطۂ مُضطر نہیں جز گِرد باد
اب یہاں کوئی اُٹھا سر نہیں جُز گِرد باد
یہ خموشی اور یہ رفتار میں آہستگی
یوں ہے جیسے غرق ہو دریائے حیرت میں کوئی
ہو گئے ناپید یکسر ورطہ و موج و حباب
جس طرح پیری میں مر جاتے ہیں ارمانِ شباب

وقت آنے پر چڑھے گا پھر یہ دریا ایک دن
پھر وہی جوشِ تلاطم اس میں ہو گا ایک دن
پھر چلی آئیں گی موجیں ناچتی گاتی ہوئی
سبزۂ ساحل کو رقصِ ناز سکھلاتی ہوئی
زندگی اس وقت جو پہلوئے دریا میں نہیں
دامنِ کہسار ہے یا آسماں اِس کا امیں
وقت پر اس کی امانت پھر اسے مل جائے گی
زندگی کی لہر ساحل تا بہ ساحل جائے گی
اے فلک، اے چاند تارو، اے فضاؤ، اے زمیں
کیا شبابِ رفتہ اپنا بھی امانت ہے کہیں؟

بہت بولنا عیب ہے

عزیزو! بہت بولنا عیب ہے
زباں بے محل کھولنا عیب ہے
تمھیں یاوہ گوئی کی عادت نہ ہو
کہ ہوتے ہیں کم عقل بسیار گو
زباں اپنی حد میں ہے بیشک زباں
بڑھے ایک نقطہ تو پھر ہے زیاں
سخن چاہیے نادر و دِلپذیر
کریں جس کی تعریف برنا و پیر

عیاں ہے کہ جو شے فراواں ہوئی
وہ بازارِ عالم میں ارزاں ہوئی

یہاں چیزِ کم یاب کی قدر ہے
ستارے بہت اور اک بدر ہے
بہت خار ہیں اور گلِ تر ہیں کم
صدف بے شمار اور گوہر ہیں کم
کہیں کوئی الماس ہے آبدار
پہاڑوں میں ہیں سنگریزے ہزار
زباں پر ہو جو بات سنجیدہ ہو
جسے سُن کے کوئی نہ رنجیدہ ہو
کسی کا ہے یہ قولِ گوہر بہا
تُو آویزۂ گوش اس کو بنا

"کہے ایک، جب سُن لے انسان دو
زباں حق نے دی ایک اور کان دو"

وقت کی پابندی

سُورج کے دم قدم سے — روشن جہاں ہے سارا
ہے اُس کی روشنی سے — دل کش ہر اک نظارا
سُورج اگر نہ ہوتا — کچھ بھی یہاں نہ ہوتا
سبزے کا، پُھول پھل کا — نام و نشاں نہ ہوتا
سُورج کی روشنی سے — ہر چیز خوشنما ہے
گو وقت کا ہے خالق — پابند وقت کا ہے

دل کش ہے چاند کیسا — ہر اک کو بھانے والا
ہنس ہنس کے آسماں سے — دل کو لُبھانے والا
پُھولوں کو اور پھلوں کو — دیتا ہے خوشنما رنگ
کلیوں میں پتّیوں میں — بھرتا ہے نت نیا رنگ
جس راہ پر چلایا — خالق نے چل رہا ہے
پابند حُکم کا ہے — پابند وقت کا ہے

وہ دلفریب تارے — روشن ہے رات جن سے
شرمندہ جن سے موتی — ہیرے ہیں مات جن سے
معلوم ہے یہ کس کو — کب سے چمک رہے ہیں
ان میں دمک وہی ہے — جس روز سے بنے ہیں
ان میں ہر اک ستارا — چھوٹا ہے یا بڑا ہے
دیکھو جو غور سے تم — پابند وقت کا ہے

غزلیات

تری قُدرت سے ہوتا ہے، تری حکمت سے ہوتا ہے
کوئی پتّھر کہیں لعلِ بدخشاں ہو نہیں سکتا

مصیبت ہی سے قدرِ عافیت ہوتی ہے دنیا میں
نہ پیش آیا ہو جس کو غم، وہ شاداں ہو نہیں سکتا

وطن کوئی ہو عزّت جوہرِ قابل سے بڑھتی ہے
گُلِ صحرا کا ہمسر خارِ بستاں ہو نہیں سکتا

دلِ انساں ہے محتاجِ ضیائے آفتابِ عشق
بغیر اس کے کسی صورت درخشاں ہو نہیں سکتا

جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم
ہم گُنہ گاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا
ظُلمتِ یاس میں اُمید کی پنہاں تھی جھلک
پردۂ شب سے ہوا نیّرِ تاباں پیدا

غیب سے ہمّتِ مردانہ کو ملتی ہے مدد　عزمِ راسخ ہو تو ہو جاتے ہیں ساماں پیدا
حق نے شاعر کے تخیّل کو وہ قدرت بخشی　ذرۂ خاک سے کر دے چمنستاں پیدا

ہر سمت اک ظہور ہے تیرے جمال کا تو نُورِ شرق و غرب و جنوب و شمال کا
ماہِ تمام نیم تبسّم ہے اک ترا خورشید ایک شمّہ ہے تیرے جلال کا
پائی ہے تجھ سے چشمِ کواکب نے روشنی تمغہ دیا ہے بدر کو تُو نے کمال کا
محروم اک اُمید پہ ہوں گرمِ جستجو "لَاتَقْنَطُوا" جواب ہے میرے سوال کا

بہاریں بار بار آئیں، چمن میں گُل کِھلے لاکھوں
نہ آیا ایک بھی جھونکا اِدھر بادِ بہاری کا
کنارِ سندھ گزری ہے مری اِک عمر اے شبنم
سلیقہ مجھ کو دریا نے سکھایا اشکباری کا

مائل بہ التفات انھیں کر بھی لیا تو کیا حالِ غمِ فراق سُنایا نہ جائے گا
دارِ فنا میں زندہ رہے جن کے بعد ہم مُنھ اُن کو روزِ حشر دکھایا نہ جائے گا

جب کسی غنچے کو کھلتے ہوئے دیکھا میں نے آ گیا یاد وہیں دل کا پریشاں ہونا
ہو گیا میری پریشاں نظری کا باعث جلوۂ حُسن کا ہر سمت فراواں ہونا

تری نظروں سے گر جانا، ترے دل سے اُتر جانا
یہ وہ اُفتاد ہے جس سے بہت اچھّا ہے مر جانا
تلاطم آرزو میں ہے، نہ طوفاں جستجو میں ہے
جوانی کا گزر جانا ہے دریا کا اُتر جانا

ہم اپنے رہزن و رہبر تھے، لیکن سادہ لوحی سے
کسی کو راہزن سمجھے، کسی کو راہبر جانا
لبِ بام آئے تم اور اُن کے چہرے ہو گئے پھیکے
قمر نے تم کو خورشید اور ستاروں نے قمر جانا

شب محفلِ عدو میں جو وہ ہم سے دُور تھا　دستِ دعائے شوق، یہ کس کا قصور تھا
دکھلائی کیوں نہ شعلۂ رُخسار کی جھلک　گر تم کو میرے جی کا جَلانا ضرور تھا

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بیتاب کوشاں تھا
ترے کوچے سے ہم نکلے، تو پھر کوسوں بیاباں تھا
رُخ و گیسو کو تیرے دیکھ کر کیا کوئی خوش ہوتا
وہ حیرانی کا باعث، یہ پریشانی کا ساماں تھا

زہے قسمت! اگر تم کو ہمارا دل پسند آیا　مگر یہ داغ کیوں کر اے مہِ کامل پسند آیا
نہ پوچھو کب سے میں شامل ہوا ہوں تیرہ بختوں میں
کسی کے عارضِ روشن کا جب سے تِل پسند آیا

پہلو میں دل کے موت کا دھڑکا لگا دیا　دی مجھ کو زندگی کہ پیامِ فنا دیا
محرومیِ نصیب کا شکوہ مِٹا دیا　سب کچھ دیا جو اِک دلِ بے مدّعا دیا
اچھی نہیں ہے یاد کسی بدنصیب کی　اچھا کیا جو آپ نے مجھ کو بُھلا دیا

دل میں بتوں کا اُنس بھی، یادِ خدا بھی ہے یوں ہم نے دیر و کعبہ کو باہم ملا دیا

عشق کی دُنیا میں جنسِ غم کو ارزاں کر دیا
ہم غریبوں کے لیے جینے کا ساماں کر دیا
زیست کی دشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا
موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کر دیا
کیا نہ کر دے تیرے دل کو وہ اگر کرنے پہ آئے
خاک کے ذرّوں کو جس نے مہرِ تاباں کر دیا

اُس سحرِ فن کے پاس سناں تھی نہ تیر تھا پھر ہو گیا الٰہی کلیجے کے پار کیا؟

حیرت زدہ میں اُن کے مقابل میں رہ گیا جو دل کا مُدعا تھا، مرے دل میں رہ گیا
جتنی صفا تھی سب رُخِ جاناں میں آ گئی "جو داغ رہ گیا مہِ کامل میں رہ گیا"
اے ہمرہانِ دشتِ محبّت چلے چلو اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا

شُہرہ تمھارے حُسن کا اب عام ہو گیا رکھیو معاف، گر کوئی بدنام ہو گیا
چشمِ بتاں میں ہے کوئی تسخیر کا عمل جس پر پڑی نگاہ، وہی رام ہو گیا
مر ہی گیا خوشی سے میں سن کر پیامِ دوست پیغامِ وصل موت کا پیغام ہو گیا

کشتیٔ اُمید اپنی دُور ساحل سے رہی جب چلی بادِ موافق، بادباں گُم ہو گیا

کس بہارِ ناز کے جلووں سے ہو کر بدحواس ڈھونڈتی پھرتی ہے بلبل، آشیاں گُم ہو گیا

تاریخ اس کو بھول سکے گی نہ اے وطن! آئے گا ذکرِ کرب ترا کربلا کے بعد
بے مہریِ بتاں سے خدا یاد آ گیا محروم کس کو یاد کرو گے خدا کے بعد

یہ شبِ اوّل فرقت کی سنبھل کر رو ذرا
ایسی راتیں آئیں گی اے دیدۂ تر، بے شمار
دردِ دل، سوزِ جگر، اشکِ رواں، داغِ فراق
سچ تو یہ ہے آپ کے احساں ہیں مجھ پر بے شمار

دیکھیے حُسن کا اعجاز، کہ بے جاں ہو کر آئینہ دیکھ رہا ہے اُنھیں حیراں ہو کر
رہ گئی عالمِ حیرت میں دمِ نظارہ نگہِ شوق نقابِ رُخِ جاناں ہو کر
دیکھتے دیکھتے آباد ہوئے ویرانے دل کی بستی نہ بسی پھر کبھی ویراں ہو کر
پھر وہیں شوق اُسے کھینچ کے لے آتا ہے جو تری بزم سے جاتا ہے پشیماں ہو کر

نکل وہمِ فنا سے واقفِ رازِ بقا ہو کر تُو میدانِ عمل میں آ حقیقت آشنا ہو کر
زمانہ خاکساری کا نہیں خوددار بن کر اُٹھ مٹا وہ راہِ منزل میں جو بیٹھا نقشِ پا ہو کر
ریا کی زندگی سے ہاتھ کیا آیا بجز حسرت کوئی دن آزما لے زندگی کو بے ریا ہو کر

ہم اپنی ذات کے دشمن ہیں خود اغیار سے بڑھ کر
کہ اپنا نفس ہے ہر دشمنِ عیار سے بڑھ کر

کبھی اے بُت شکن سوچا بھی ہے، دیکھا بھی ہے تو نے
کہ بُت کوئی بڑا کم ہے بُت پندار سے بڑھ کر
ہر اک آزار سے محفوظ ہو انساں اگر سمجھے
کہ ہے رسمِ دل آزاری ہر اک آزار سے بڑھ کر

یاد ہے اب تک طبیبوں کو وہ حسرت کا سماں آسماں کو دیکھنا میرا دَوا کو دیکھ کر
خواب میں بھی رات بھر آہُو نظر آتے رہے شب جو سوئے تیری چشمِ فتنہ زا کو دیکھ کر

دُنیا میں اے زباں! روشِ صلحِ کُل نہ چھوڑ جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ
ہمدم! کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے ایامِ حُسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

فوارہ ساں نہ جوشِ خودی میں اُچھل کے چل نیچا ہے سر غُرور کا غافِل سنبھل کے چل

اب جی میں ہے کہ ہاتھ سے جانے نہ پائے دل
آنے نہ دوں کسی پہ جو قابُو میں آئے دل
کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی
کس سے کہوں جو تم نہ سنو ماجرائے دل
تکلیفِ سیرِ گُل مجھے اے ہم نشیں نہ دے
پھولوں سے کم نہیں ہیں مرے داغہائے دل

کس طرح آخر پہنچتے تا درِ جاناں نہ ہم تھے اسیرِ امتیازِ کعبہ و بت خانہ ہم

آخری منزل میں اِک سنگیں حقیقت بن گئی　　زندگی جس کو سمجھتے آئے تھے افسانہ ہم

کس مُنھ سے شکوہ اُن کے نہ آنے کا کیجیے
جب جا سکے نہ اُن کے نہ آنے پہ جاں سے ہم
دل مجھ سے پُوچھتا ہے کہ جائیں گے اب کہاں
میں دل سے پوچھتا ہوں کہ آئے کہاں سے ہم

جب دل کا حال کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم　　لیتے ہیں کام نالہ و آہ و فغاں سے ہم
کترا کے اب گزرتے ہیں کوئے بتاں سے ہم
"کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم"

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں　　وہی اک آرزو ہے اور میں ہوں
تصور ہے کسی کا اور دل ہے　　وہ رُوبرو ہے اور میں ہوں

ایک ہم ہیں، اپنے گلشن کو جو صحرا کر چکے　　ایک وہ ہیں دشت میں جو گلستاں پیدا کریں

یادِ جمالِ دوست میں برقِ تپاں کی طرح　　بے چین ہی رہا دلِ بے تاب ابر میں

ذرّاتِ خاک بن نہیں جاتے نجوم کیوں　　حیرت سے دیکھتا ہوں تری رہگذر کو میں

کون ہے ضیا افگن چاند میں ستارے میں
آگ کس کی ہے روشن برق کے شرارے میں

تیرے اِک تبسّم سے رُوحِ زندگی شاداں
کام ہے تمام اس کا تیرے اِک اشارے میں

سامنے ہے بحرِ عشق اور ہے دُعا میری
یا رہوں کنارے پر یا ہوں تیز دھارے میں

کیوں پیش وپس ہے آپ کو لینے میں دل مرا دیتا ہوں اک نگاہ پہ اتنا گراں نہیں
چکّی کے دو ہیں پاٹ کہ ہم جن میں پس گئے محروم یہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

ہے اُن کے عہدِ وفا سے مناسبت دل کو اُسے قیام نہیں ہے، اِسے قرار نہیں
جہاں میں بلبلِ باغِ خزاں نصیب ہوں میں مری نواؤں میں رنگینیِ بہار نہیں

ہم رہروِ قدیم ہیں اور جانتے ہیں خوب ہموار رہگذار کبھی ہے، کبھی نہیں
ظالم تمام عمر رہا دل کے آس پاس اِک غم جو خوشگوار کبھی ہے، کبھی نہیں

وہ فصل کون سی ہے جو راس آئے گی ہمیں تسکیں بہار میں نہیں، برسات میں نہیں
جو جس کے جی میں آئے لکھے اور چھاپ دے
کچھ فرق شعر اور خرافات میں نہیں

چمکتے پیری میں ہوں گے یہ داغہائے شباب کہ شام ہوتی ہے جس دم، چراغ جلتے ہیں
سَفر میں زحمتِ پا سے جو جی چُراتے ہیں وہ بیٹھے دُور ہی منزل سے ہاتھ ملتے ہیں

اگرچہ فردِ عمل ہم سیاہ رکھتے ہیں خدا کے فضل و کرم پر نگاہ رکھتے ہیں
کہاں میں ذرۂ خاکی، کہاں مزاج اُن کا جو شانِ مہر و اداہائے ماہ رکھتے ہیں

ہے صبح اور آج پریشاں ابھی سے ہیں یعنی شبِ فراق کے ساماں ابھی سے ہیں
روزِ جزا ہے دُور، پر اے کردگار، ہم! شرمندۂ فزونیِ عصیاں ابھی سے ہیں

ہر ذرّہ اُن کی بزم کا خورشید ہے مجھے یارب مری نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
پائیں حُضورِ عشق سے یہ سرفرازیاں نالے بہت بلند جو مجھ ناتواں کے ہیں

تمنّا ہے کہ مجھ سے یہ نہ چھوٹے بعد مُردن بھی
وطن کی سرزمیں ہے انتخابِ دو جہاں مجھ کو
شریکِ درد و غم کوئی، نہ پُرسانِ الم کوئی
شکایت ہے مقدّر سے کہ لے آیا کہاں مجھ کو

لاکھوں ہیں دل رُبا، کوئی دلدار بھی تو ہو غم دے چکے بہت، کوئی غم خوار بھی تو ہو
افسوس ہے کہ ساتھ تمھارے نہ میں رہوں موجود گُل جہاں ہے وہاں خار بھی تو ہو

زندگی ناکامیوں کی اِک مسلسل داستاں　　موت کیا ہے زندگی کی داستاں کا خاتمہ
کوئی پستی سے نہ ہو نادم، نہ نازاں اوج پر　　ایک دن ہو گا زمین و آسماں کا خاتمہ
اے دلِ غمدیدہ، خوش ہو جا کہ ہو جانے کو ہے　　زندگی کے ساتھ غمہائے نہاں کا خاتمہ

گیا ہے چھوڑ کر وہ حُور وش نقشِ قدم اپنے
انھیں پھُولوں سے ہے گلزارِ جنّت اپنا کاشانہ
محبّت اور جنوں میں قُرب ہے اور بُعد بھی کِتنا
کہاں لیلیٰ کا کوچہ اور کہاں مجنوں کا ویرانہ

خوشی کی آرزو بے سود ہے اس میں، یہ دنیا ہے
جہاں انساں سے انساں کی خوشی دیکھی نہیں جاتی
یہ ہے ارشادِ حُسنِ دورِ حاضر ''بند رکھ آنکھیں
اگر تجھ سے مری بے پردگی دیکھی نہیں جاتی''

کم نہ تھی صحرا سے کچھ بھی خانہ ویرانی مری
میں نکل آیا کہاں اے وائے نادانی مری
کیا بناؤں میں کسی کو رہبرِ ملکِ عدم!
اے خضر! یہ سر زمیں ہے جانی پہچانی مری
جان و دل پر جتنے صدمے ہیں اِسی کے دم سے ہیں
زندگی ہے فی الحقیقت دشمنِ جانی مری

سیہ بختی پہ رہتی ہے نظر اہلِ بصیرت کی
اِسی سُرمے سے بینائی ہے قائم چشمِ عبرت کی
دلِ حیراں ہے حیرانی نہ نکلی ہے نکلے گی!
میں انساں ہوں الٰہی، یا ہوں پُتلی چشمِ حیرت کی
گردش نہ کام آئی ذرا سال و ماہ کی
حالت وہی رہی مرے حالِ تباہ کی
آخر ہیں یہ بھی تو اُسی صانع کی صنعتیں
قلعی نہ آپ کھولیے خورشید و ماہ کی

مندر بھی صاف ہم نے کیے، مسجدیں بھی پاک مشکل یہ ہے کہ دل کی صفائی نہ ہو سکی
"فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں" اِن مشکلوں سے عہدہ برآئی نہ ہو سکی
مُنکر ہزار بار خدا سے ہُوا بشر اک بار بھی بشر سے خدائی نہ ہو سکی

نہ بچ سکا یہ کبھی اِنقلاب کی زد سے بشر کے ساتھ رہیں گردشیں زمانے کی
جو نیک نام رہا زندگی اُسی کی ہے وہ کیا جیا جو کسی سے نہ کر سکا نیکی
عدم کو جائیں ہمیں، اُن سے جا ملیں محروم ہمیں سُنا کے گئے ہیں جو پھر نہ آنے کی

ہم نشیں مجھ کو نہ فرضی غم کے افسانے سُنا مجھ کو کافی ہے یہ میری داستانِ زندگی
کاوشیں ہی کاوشیں ہیں، راحتوں کا ذکر کیا زندگی میرے لیے ہے امتحانِ زندگی

نغمے سمجھ رہا ہے انھیں ناسخن شناس　مجموعہ مرثیوں کا ہے دیوانِ زندگی
پایا کہیں نہ گوہرِ مقصود کا نشاں!　چھانی بہت ہے خاکِ بیابانِ زندگی
تسکینِ دل بہ جز غمِ اُلفت کہیں نہیں　ثابت ہوا کہ درد ہے درمانِ زندگی

رونے دھونے میں کٹی افسوس ساری زندگی　ہو گئی گویا شبِ فرقت ہماری زندگی
ہم نشیں مجھ کو بتا کہتے ہیں کس کو زندگی　نالہ وشیون ہے یا ہے آہ وزاری زندگی

کس کو فرصت تھی، خیالِ لذتِ دیدار کی　سامنے جب تک رہے وہ، بیخودی طاری رہی
خودنمائی سے رہا پرہیز ہم کو عمر بھر　خودفراموشی اب آئی، پہلے خودداری رہی

قیس و فرہاد کی تقلید پہ مرنے والے　دشت و کہسار میں ہیں نقش وہ آداب ابھی
فیضِ قدرت میں کمی کوئی نہیں ہے لیکن　پھر بھی محتاج ہے یہ عالمِ اسباب ابھی

کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دُنیا کی راحت بھی

اِس کا گلہ نہیں کہ دُعا بے اثر گئی　اک آہ کی تھی وہ بھی کہیں جا کے مر گئی
اے ہم نَفَس نہ پوچھ جوانی کا ماجرا　مَوجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی
دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید　ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی
ہرموجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ وتاب　محروم جب وطن میں ہماری خبر گئی

دل ہو تو دل میں تیری تمنّا کرے کوئی
بیدل مری طرح ہو تو پھر کیا کرے کوئی
ممکن ہے پھر ہو شعلۂ حُسنِ ازل عیاں
مثلِ کلیم مشقِ تقاضا کرے کوئی
ہو گی مآلِ کار پریشانیِ نظر
پیدا نہ دل میں ذوقِ تماشا کرے کوئی
کل کی نہ ہو اُمید تو پھر کس اُمید پر
آباد آرزوؤں کی دُنیا کرے کوئی
محروم محوِ شعر ہے، اس سے غرض نہیں!
قدرِ سخنوری نہ کرے یا کرے کوئی

پشیماں ہیں وہ کر کے پُرسشِ حالِ دلِ شیدا
ہویدا حسرتِ پنہاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
یہ فطرت کا تقاضا تھا، کہ چاہا خُوبرویوں کو
جو کرتے آئے ہیں انساں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

قسم خدا کی زمانہ یقین کر لیتا
اگر خدائی کا دعویٰ یہ خُوبرو کرتے
تمھارے ہاتھ سے مرنا نصیب اگر ہوتا
"مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزُو کرتے"

ملتا ہے مشکلوں سے کسی کے حضور کا
وہ ایک لحظہ زیست کا حاصل کہیں جسے
اُس دل کو شاد رکھنے کی خدمت ملی مجھے
غمہائے روزگار کی منزل کہیں جسے
اِس دَورِ قدر دانِ سخن میں بہ اتفاق!
شاعر وہی ہے رونقِ محفل کہیں جسے

پہلو میں دل ہے درد کی دُنیا کہیں جسے
پر اس قدر اُجاڑ کہ صحرا کہیں جسے
وہ رُعبِ حُسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات
یوں حالِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے

دل بستگی بڑھا کر غمِ خانۂ جہاں سے آئے پلٹ پلٹ کر دنیائے جاوداں سے
جانِ جہاں وہ خود ہے اور جسمِ دہرِ فانی قائم نظامِ عالم ہے ربطِ جسم و جاں سے

سحر کے آنے کا وعدہ تو کر گئے، لیکن! مریضِ ہجر کا آ کر مزار دیکھیں گے

اِسی اُمید پہ جیتے ہیں طالبِ دیدار کہ جیتے ہیں تو کبھی رُوئے یار دیکھیں گے
سپوت تیرے تجھے مادرِ وطن کب تک؟ خراب و خستہ و زار و نزار دیکھیں گے

عبث نام و نشاں پر ناز کرتے ہیں جہاں والے
کہ ہو کر نقشِ باطل مٹ گئے نام و نشاں والے
ہے قائم اُن کے سر پر بھی تو آخر آسماں کوئی
بہت اونچے سہی اہلِ زمیں سے آسماں والے

میں خُوش ہوا دمِ رخصت جو مسکرا کے چلے خبر نہ تھی کہ وہ برقِ ستم گِرا کے چلے
جو سر پہ تاجِ سکندر بھی ہو تو دنیا میں بشر کو چاہیے ہرگز نہ سر اُٹھا کے چلے

شبِ ہجراں کی صورت دن ڈھلے سے پھر نظر آئی
الٰہی! بھیج دے صبحِ قیامت شام کے بدلے
تکلّف برطرف ساقی! ترے میکش کو ہے کافی
تصوّر تیری آنکھوں کا سُرورِ جام کے بدلے

دل خاک ہو کے بیٹھ نہ جائے تو کیا کرے کوچے میں غیر کے جو ترا نقشِ پا ملے

کوئی نہ ساتھ منزلِ مقصود تک گیا راہِ فنا میں گرچہ بہت ہمسفر ملے
یوں زندگی سے مل کے جوانی جدا ہوئی جیسے کسی سے کوئی سرِ رہگذر ملے
دیتا ہمارے نالۂ خُونیں کی داد کون سب اپنی حسرتوں کے یہاں نوحہ گر ملے

لکھا ہے اُس کے مقدر میں اضطرابِ دوام قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے
نصیب راحتِ قُربِ دوام ہو جس کو وہ لذّتِ خلشِ انتظار کیا جانے
کہاں یہ شامِ غریباں، کہاں وہ صبحِ وطن یہ فرق گردشِ لیل و نہار کیا جانے

بگڑ گئے ہیں وہ نقشے، بدل گیا عالم اُجڑ گئے ہیں خیالات کے پَری خانے
بہت عزیز تھے غربت کے سبزہ زاروں سے جنوں نواز وہ اپنے وطن کے ویرانے
دیارِ غیر ہو محروم، یا وطن اپنا وہی ہے دوست ہمارا جو ہم کو پہچانے

تمام عُمر پریشاں رکھا، دمِ آخر بلا سے میری پریشاں وہ بال کر بیٹھے
نہ عِلم ہے، نہ زباں ہے تو کس لیے محروم تم اپنے آپ کو شاعر خیال کر بیٹھے

کہتے ہیں میرے کوچے میں رکھنا نہ پھر قدم جانا پڑے گا اب تو وہاں سر کے بَل مجھے

آہِ شرر آمیز میں کیوں کر اثر آئے
جلتے ہوئے پودے میں کہاں سے ثمر آئے

دی کیسے نزاکت نے اجازت یہ سفر کی
"تم آنکھوں سے دل میں مرے کیوں کر اُتر آئے"

"نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال" دل سے گئے تھے کب، جو کہوں دل میں آ گئے
احساسِ کمتری سے ہیں شاید یہ سرنگوں خورشید و ماہ کس کے مقابل میں آ گئے
نکلیں گے جیسے چاند گہن سے نکل پڑے انوارِ حق جو سایۂ باطل میں آ گئے
محروم اب تو جاگیے غفلت کی نیند سے ایامِ زیست آخری منزل میں آ گئے

خزاں سے پیشتر سارا چمن برباد ہوتا ہے
غضب ہوتا ہے، جب خود باغباں صیاد ہوتا ہے
خوشی کے بعد اک تُو ہی نہیں ہے مبتلائے غم
یُونہی اکثر جہاں میں، اَے دلِ ناشاد، ہوتا ہے
جو کرتا ہے نثارِ نوعِ انساں اپنی ہستی کو
وہ انساں افتخارِ عالمِ ایجاد ہوتا ہے
مرے اشعار کی توصیف ہوتی ہے مرے ہوتے
نہیں معلوم میرے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے

لائقِ تکیہ نہیں عالمِ فانی اے دل! دیکھتے دیکھتے جو نذرِ فنا ہوتا ہے

دل جلوہ گاہِ عالم میں اس کو ڈھونڈتا ہے
جلوے عیاں ہیں جس سے، جلووں میں جو چھپا ہے

اِک اضطرابِ پیہم پہلے تھا، اب سکُوں ہے
وہ غم کی ابتدا تھی یہ غم کی انتہا ہے

کب ملا چین وطن میں دلِ ناشاد تجھے — درد کیوں تجھ کو وطن کا ہے وطن کس کا ہے
اس غزل میں نہ تخلّص نہ کسی کا ہے نام — خود سمجھ جایئے اندازِ سخن کس کا ہے

تابِ نظارہ نہیں گو مجھے خود بھی لیکن! — رشک کہتا ہے کہ ایسا ہی جمال اچھا ہے

نظر اُٹھا دلِ ناداں، یہ جستجو کیا ہے — اُسی کا جلوہ تو ہے اَور رُوبرو کیا ہے
گدا نہیں ہیں کہ دستِ سوال پھیلائیں — کبھی نہ آپ نے پُوچھا کہ آرزو کیا ہے
سخن ہو سمع خراشی تو خامُشی بہتر — اثر کرے جو نہ دل پر، وہ گفتگو کیا ہے

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم، آزار کش بیداد رہے
سبزے کی طرح پامال ہوئے، نکہت کی طرح برباد رہے

ہوئیں نہ روئے حقیقت سے آشنا آنکھیں — کہ ہم اسیرِ خمِ گیسوئے مجاز رہے
سرِ نیاز خم اور دوش فارغ از احساں — جو یوں رہے وہی دنیا میں سرفراز رہے

باعثِ شرمندگی ہو گی حیاتِ جاوداں — ورنہ لوگوں سے خضر کس واسطے رُوپوش ہے

دیکھیے دل میں کسی کی آرزُو کب تک رہے؟ — اور وہ بیگانہ خُو، بیگانہ خُو کب تک رہے؟

شوخیوں سے جب وہ قائم اک جگہ رہتے نہیں — پھر تصور آہ! اُن کا رُوبرو کب تک رہے؟
فرصتِ اظہارِ اُلفت دیں تو اے دل کچھ کہوں — دیکھیے یہ ابتدائی گفتگو کب تک رہے؟

اب جہاں میں اُن کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں
عمر بھر جو فکرِ تسخیرِ جہاں کرتے رہے

کسی قابل نہیں ہیں ہم، مگر یہ فخر حاصل ہے
کہ دل اپنا غمِ بیتابیِ اُلفت کے قابل ہے
اسیرِ کش مکش ہائے اُمید و بیم ہوں، ورنہ
نہ جینے میں ہے دشواری، نہ مرنا کارِ مشکل ہے

یہ حیرت خانۂ دُنیا طِلسمِ حُسنِ پنہاں ہے — وہی کچھ مطمئن اس میں نظر آیا جو حیراں ہے

پروانہ جس کا میں ہوں، جو میری نظر میں ہے — وہ نُورِ شمع میں ہے، نہ شمس و قمر میں ہے
وہ بے قرار دل مرے پہلو میں ہے، جسے — دشتِ سفر میں چین، نہ آرام گھر میں ہے
عالَم رَوارَوی کا ہے آٹھوں پہر یہاں — دُنیا میں ہے بشر، کہ مسافر سفر میں ہے
انسانیت کی منزلِ مقصود ہے کہاں — صدیاں گزر گئیں یہ ابھی رہ گزر میں ہے

جوانی اور بُوئے گُل میں یارب کیا تعلق تھا
کہ بُوئے گُل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

غزل اب ختم ہو جاتی ہے اپنی پانچ شعروں پر
جوانی اور طبیعت کی روانی یاد آتی ہے

لوگ مر جاتے ہیں کیوں تیری گلی میں آ کر   یہ وہ کُوچہ ہے جہاں بچ کے قضا چلتی ہے

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم
مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے
کبھی پانی پہ ہوتا ہے سرابِ دشت کا دھوکا
کبھی ریگِ رواں آبِ رواں معلوم ہوتی ہے
بیاں کرتا ہے جب کوئی کہیں رودادِ غم اپنی
مجھے یکسر وہ اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

وطن کا نام مِٹ سکتا نہیں تاریخِ عالم سے
بزرگانِ سَلَف، جب تک تمھاری آن باقی ہے
رہے گا یہ ہمارا دَور بھی ننگِ وطن جب تک
وطن کی سرزمیں پر ایک بھی انسان باقی ہے
ہزاروں مشکلیں آساں ہوئیں، لیکن مرے دل میں
جو مشکل ہو نہیں سکتی کبھی آسان باقی ہے
خدا جانے ہماری زندگی احسان ہے کس کا
کہ جب تک زندگی موجود ہے، احسان باقی ہے

کیا ہے خون لاکھوں بے گناہوں کا مگر پھر بھی
اہنسا برہمن کی، شیخ کا ایمان باقی ہے

وائے ناکامی کہ بعدِ مرگ یہ ظاہر ہوا تھی ضمیرِ دوست میں مضمر وفا میرے لیے
یاد جب بھی آ گئی تیری نگاہِ اوّلیں کُھل گیا اِک دفترِ مہر و وفا میرے لیے

دیکھتا ہوں ہر کہیں حسنِ ازل کا انعکاس
ذرّہ ذرّہ غیرتِ خورشید ہے میرے لیے
صاف آتا ہے نظر انجام ہر آغاز کا
زندگانی موت کی تمہید ہے میرے لیے
جاگ اُٹھتی ہے تہِ دامانِ شب سے صبحِ نو
موت کیا ہے زیست کی تجدید ہے میرے لیے

رباعیات

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا   افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں   انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

ہے رحم و کرم سے آج بیزار انساں   انساں سے ہے برسرِ پیکار انساں
دنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے   کس منہ سے ہے جنّت کا طلبگار انساں

لڑتے نہیں واقفِ مقام آپس میں   برہم ہوتے ہیں کج خرام آپس میں
مذہب کے نام پر بحکمِ ابلیس   لڑتے ہیں نفس کے غلام آپس میں

اُڑتے دیکھا جو طائرِ پرّاں کو   اُڑنے کی امنگ لے اُڑی انساں کو
گولے برسا دیے زمیں پر اس نے   پرواز نصیب جب ہوئی ناداں کو

ہر صبح بلند جب علَم کرتا ہے   سر تیرے حضور اُٹھ کے خم کرتا ہے
لوح افلاک پر شعاعی خط میں   خورشید تری ثنا رقم کرتا ہے

دنیا نے عجب نقش جما رکھا ہے   ہر اِک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے   اس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

جب فصلِ بہار گلفشاں ہوتی ہے   یا جب برسات انیسِ جاں ہوتی ہے
فطرت کس درجہ دلستاں ہوتی ہے   اِک سال میں دو بار جواں ہوتی ہے

تلوک چند محروم

ان کی شاعری کا جو وصف خاص طور سے پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح ومحبت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جناب محروم کے پیشِ نظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔ کیفیتِ غم بھی ان کے کلام کی ایک خصوصیت ہے۔

— سر عبد القادر

وہ غزلیں بھی اچھی کہتے ہیں۔ ان کے یہاں قدرتی طور پر اقبال کا اثر نمایاں ہے۔ مگر ان کا مزاج اقبال سے مختلف ہے۔

— آلِ احمد سرور

ان کے کلام میں جو بنیادی خصوصیت ملتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے کلام سے صلح ومحبت اور پریم اور آشتی کا پرچار کرتے ہیں۔

— ڈاکٹر محی الدین قادری زور

جناب محروم کی شاعری گردوپیش کی ساری تحریکوں سے گزرتی رہی ہے لیکن ان کا اندازِ فکر ان کا اپنا ہے، اور وہ مستحکم بنیادوں پر ٹکا ہوا تھا۔

— عبد القادر سروری

ISBN 978-0-19-940776-7

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

RS 160

www.oup.com
www.oup.com.pk